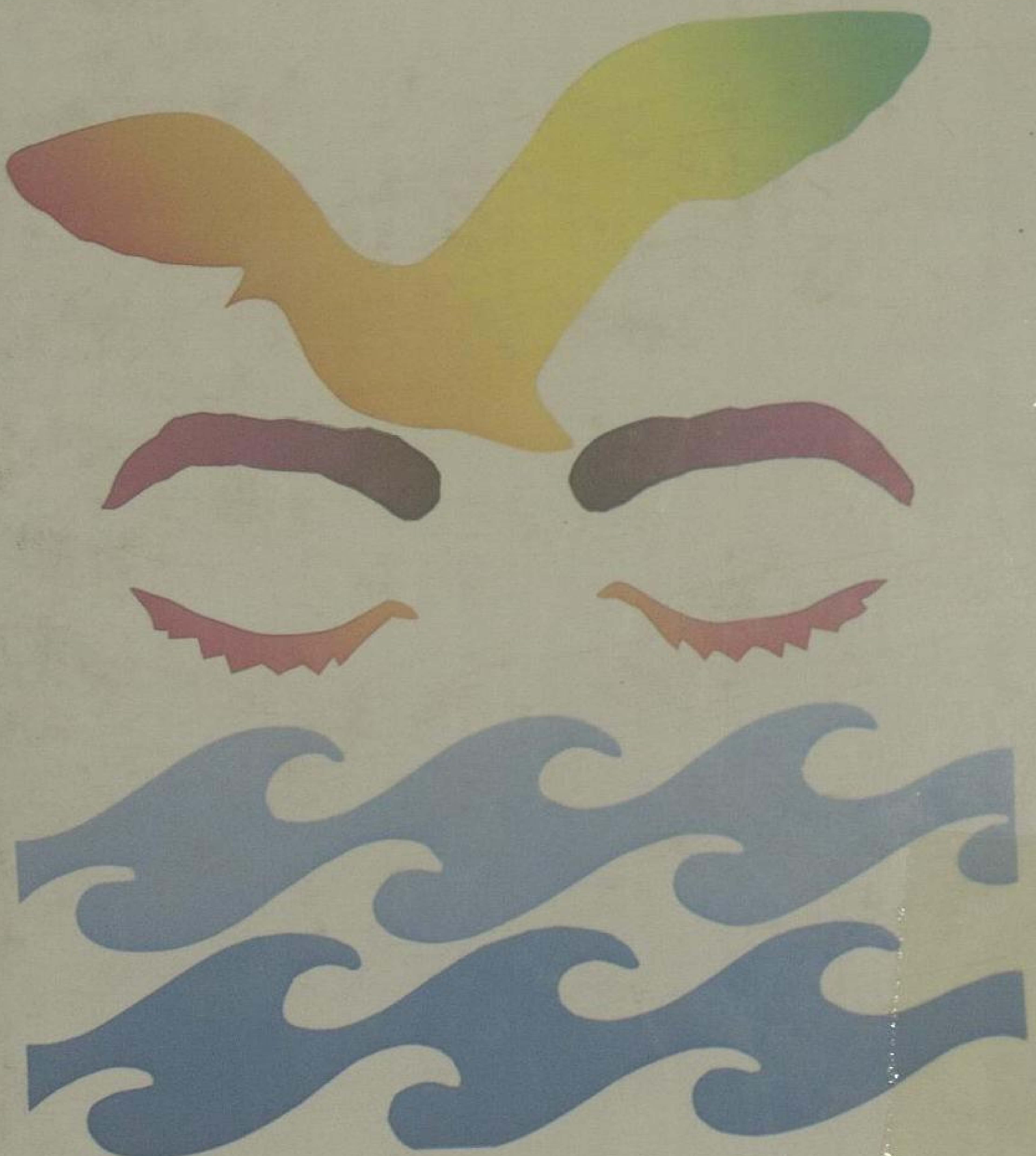
ابھی اِک خواب رہتا ہے



حامد یزدانی

ابھی اِک خواب رہتا ہے

پاپا کے نام
جن کے حسنِ تربیت سے
میرے اظہار کا حرف حرف آئینہ
ترتیب پایا ہے

یزدانی جالندھری

And nights bright days when dreams do show thee me.

(William Shakespeare)

جہانِ شب گزیدہ کے مکیں، اے صبح کے طائر!
میں کیونکر کھول دوں آنکھیں، ابھی اک خواب رہتا ہے

ترتیب

حمدیہ

دشتِ غربت میں کٹے یا سرِ منزل گزرے
کوئی لمحہ نہ تری یاد سے غافل گزرے

بسم اللہ الرحمن الرحیم O

شعر، عشق اور خواب

O Poesy! for thee I hold my pen,
That am not yet a glorious denizen
Of thy wide heaven.............

(John Keats)

مجھے اپنی پہلی کتاب کے لئے حرفِ ابتدا لکھنے کا مشکل مرحلہ درپیش ہے----مگر سوال یہ ہے کہ لکھنا کیا ہے---؟ شاید یہ کہ شاعری کیا ہے؟ یا یہ کہ میرا اس سے کیا سروکار اور کیا تعلق، واسطہ ہے؟ شاعری کیا ہے کی بات تو ایک طرف رہی- میں تو ابھی اس سوچ میں ہوں کہ زندگی کیا ہے؟ "فقط قیدِ عناصر کا ظہور"- یا اس سے سوا کچھ اور---؟

زندگی کے بارے میں سوچنے بیٹھیں تو بے شمار توجیہات، ذہن کے دروازے پر دستک دینے لگتی ہیں---متعدد نظریات، عقدہ کشائی پر آمادہ دکھائی دیتے ہیں، مگر طویل غور و فکر کے بعد بھی کچھ ہاتھ نہیں آتا---شاعری بھی ایک ایسا ہی پُراسرار عمل ہے، غور کرتے چلے جائیے----اور سُلجھاؤ کی ہر کوشش، ڈور میں کچھ اور الجھاؤ بڑھا دیتی ہے-

کچھ یہی صورت مجھے خواب اور عشق میں بھی دکھائی دی---- کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ شعر، عشق اور خواب، زندگی کے تین بنیادی اجزاء ہیں- بالکل ایسے ہی جیسے آگ، پانی اور ہوا- کہ ان میں سے ایک جزو بھی کم ہو تو سانسیں منجمد ہونے لگتی ہیں- زندگی معدوم ہونے لگتی ہے- تاہم یہ سراغ لگانا مشکل ہے کہ انسان، پہلے، کس تجربے سے بہرہ مند ہوا- خواب کے شعر کے، یا عشق کے؟ کبھی

تو یہ واقعہ یوں رونما ہوتا ہے کہ انسان خواب کے راستے عشق کی بشارت پاتا ہے اور پھر عشق کی پُر پیچ راہداریوں سے ہوتا ہوا شعر کے پُراسرار محل میں داخل ہو جاتا ہے---- اور کبھی یوں کہ شعر سے شروع ہونے والا سفر، عشق اور لگن کی منازل طے کرتا، خواب کے جزیرے میں پڑاؤ کرتا ہے۔

دُور کیا جانا، اقبال ہی کی مثال لے لیجئے۔ شعر برائے شعر سے آغاز ہونے والا تجربہ بیداریٔ قوم کے عشق کی معراج حاصل کرتا ہوا، قیامِ پاکستان کے خواب پر منتج ہوا---- سوچنے پر کئی اور مثالیں بھی مل جائیں گی۔ اور ان سب کا حاصل بھی یہی ہو گا کہ شعر، خواب اور عشق کی تثلیث بہت حد تک لازم و ملزوم ہے۔ اس تثلیث پر، بعض اوقات بے عملی کا جو الزام عاید کیا جاتا ہے وہ بھی قطعی بے بُنیاد اور غلط ہے کیونکہ یہ اجزاء نہ صرف یہ کہ خود عمل سے تعبیر ہیں بلکہ بسا اوقات کئی ایک دوسرے عوامل کے لئے تحریک کا باعث بنتے ہیں۔ سو محرکات پر بے عملی کا الزام، کس حد تک معقولیت پسندی قرار دیا جا سکتا ہے؟

سوچتا ہوں---- کیا زندگی، عشق کے پانیوں پر رواں دواں شعر کی ناؤ ہے ـــــــ جسے خواب کے بادبان کا سہارا میسر ہے؟ یا تاریخِ اظہار کی وہ آگ جسے عشق اور خواب کی "آب و ہوا" اور بھڑکا رہی ہے؟ شاید اسی آگ کے جاں سوز الاؤ سے شعر کی چنگاریاں پھوٹتی ہیں جو اہلِ دل کے لئے رہنما ستاروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

میں نے بھی اپنا دامنِ امید، انہی چنگاریوں کے لئے پھیلا رکھا ہے---- میری راتوں کی سرد وسعتیں بھی انہیں رہنما ستاروں کی منتظر ہیں۔

حامد یزدانی

۲- اکتوبر ۹۲

(کولون) جرمنی

نعت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

گُلِ توصیف بنوں، برگِ ثنا ہو جاؤں
کاش میں آپ کا نقشِ کفِ پا ہو جاؤں

آپ چاہیں تو مرے حرف بھی روشن کر دیں
آپ چاہیں تو میں خورشیدِ نوا ہو جاؤں

حرفِ بے صوت کی صورت ہوں لبِ امکاں پر
اِذن مل جائے تو اِمکانِ ادا ہو جاؤں

میرے آقا مری پہچان فقط آپ رہیں
گرد ہُوں کاش گُلِ گردِ صدا ہو جاؤں

روشنی میرے مقدّر پہ سدا رشک کرے
کاش گردِ رہِ مہتابِ حرا ہو جاؤں

آپ سمٹیں تو زمانوں کا احاطہ کر لیں
میں جو پھیلوں بھی تو عکسِ کفِ پا ہو جاؤں

رنگ کھل جائیں سرِ شاخِ ابد اے حامد
لوحِ آفاق پہ اک حرفِ دُعا ہو جاؤں

خواب اور دُعا کی نظم
(پاکستان کے لئے)

ریشمی دھان کے کھیت جیسی
مہکتی ہوئی اک سحر
وقت کی سرخ تاریخ میں
سبز، سر سبز سانسوں سے
لکھا ہوا ایک حرف
خواہشوں کی طراوت میں بھیگا ہوا

ایک نام

میرے بابا کی اجلی دعاؤں میں
لپٹی ہوئی آرزُو
آسماں کے حسیں، نیلگوں آئینے پر جڑی
اک ستاروں کی نظم

اس زمین کے دہکتے ہوئے ہاتھ پر
ایک شبنم کا قطرہ
(چمکتا ہوا، نرم، شیریں سا قطرہ)
کہیں دشتِ افلاک میں

مہرباں ماہتاب

پاک پھولوں کے رنگوں سے تحریر
روشن کتاب

وقت کی مٹھیوں سے جھلکتا ہوا ایک خواب
میری ماں کے دوپٹے میں
باندھے ہوئے آنسوؤں کا اثر---
ریشمی دھان کے کھیت جیسی
مہکتی ہوئی اے سحر---!
میرے دل میں اُتر



عشق میں بھی مرے انداز روا رکھتا ہے
آج کے کام بھی دل، کل پہ اٹھا رکھتا ہے

دیکھیے، دشت میں کھلتے ہیں کہاں لالہ و گلُ
دیکھیے، پاؤں کہاں آبلہ پا رکھتا ہے

وہ پرندہ کبھی گرتا نہیں بے دم ہو کر
جو پروں میں رم و رفتارِ ہوا رکھتا ہے

کون خوُد بجُھ کے سرِ شام، اُفق کے اس پار
میرے آفاق کو، تاروں سے بھرا رکھتا ہے

شبِ تیرہ میں وہ مہتابؑ نُما دستِ خیال
میری پلکوں کے دریچوں میں دیا رکھتا ہے

کیا خبر تھی کہ مرا عشق، ہوس ٹھہرے گا
میں سمجھتا تھا کہ یہ رنگ، جُدا رکھتا ہے

پھیلتی جاتی ہے یوں درد کی خوشبو حامد
جیسے دل زخم نہیں، برگِ حنا رکھتا ہے

ایسا تو نہیں منزل و جادہ نہیں رکھتے
ہم لوگ فقط حسنِ ارادہ نہیں رکھتے

یہ گردِ ملامت جنہیں پوشاک ہوئی ہو
وہ تن پہ ندامت کا لبادہ نہیں رکھتے

نفرت ہو، محبت ہو، کوئی غم ہو، خوشی ہو
ہم کچھ بھی ضرورت سے زیادہ نہیں رکھتے

صورت نہ سہی، اک خطِ امکاں تو کھنچا ہے
ہم صفحۂ دل کو کبھی سادہ نہیں رکھتے

کیا ان سے رہ و رسمِ محبّت ہو کہ یہ لوگ
دامن تو کُجا، دل بھی کشادہ نہیں رکھتے

بس ایک نظر ہی میں جو ہاتھوں سے نکل جائے
پہلو میں ہم ایسا دلِ سادہ نہیں رکھتے

رکھتے تو ہیں ہم اور بھی کچھ کام ضروری
لیکن تری چاہت سے زیادہ نہیں رکھتے

فصیلِ غم میں دریچہ کوئی تو رہنے دو
خوشی کے واسطے رستہ کوئی تو رہنے دو

مرے نصیب کی ویران رہ گذاروں میں
کرن، خیال، اجالا کوئی تو رہنے دو

مہکتے خواب کہیں راستہ نہ کھو بیٹھیں
کنارِ چشم دیا سا کوئی تو رہنے دو

کوئی تو صُبح تلک ہو اُمید کی صُورت
کہ دشتِ شب میں ستارا کوئی تو رہنے دو

یہ کیا کہ وقت تمہاری ہی دسترس میں رہے
مری گرفت میں لمحہ کوئی تو رہنے دو

نویدِ صُبحِ طرب کون دینے آئے گا
کسی شجر پہ پرندہ. کوئی تو رہنے دو

گھر سے نکلے تھے پانے کو منزل تیرے جمال میں ہم
لیکن آج بھی اٹے ہوئے ہیں، گردِ رہِ ملال میں ہم

وقت ملے تو کھوج لگانا بھولے بسرے لمحوں کا
حرف کی صورت بھٹک رہے ہوں شاید کسی سوال میں ہم

جانے کون سا عکسِ تحیّر ہم کو نجات دلائے گا
جانے کب تک قید رہیں گے آئینے کے جال میں ہم

یاد ہے ربِّ ابر سے عمر کی دو اک بوندیں مانگی تھیں
لیکن اب تک بھیگ رہے ہیں بارشِ ماہ و سال میں ہم

یہ صورت خوش فہمیٔ دل کی جانے کون سی منزل ہے
اپنا چہرہ ڈھونڈ رہے ہیں، تیرے خدّوخال میں ہم

آنکھیں موندیں گے تو حُسنِ شب کے منظر جاگیں گے
سو جاتے ہیں چاندنی اوڑھ کے حامد اسی خیال میں ہم

دشتِ خزاں میں اک گلِ امکاں کھلا تو ہے
اس رنج میں نشاط کا پہلو ملا تو ہے

تاریکیوں میں ایک کرن سی اُتر گئی
پتھر انا کا اپنی جگہ سے ہلا تو ہے

گر سوزنِ مژہ نہیں، دستِ حنا سہی
آخر کسی سے زخمِ تمنا سلا تو ہے

اس دل کے خاک زار پہ ٹھہری نہیں کبھی
میرے جنوں کو، ان کی نظر سے گلہ تو ہے

حامد اب اپنے پاؤں میں زنجیرِ غم نہیں
لیکن کسی کی یاد کا اک سلسلہ تو ہے

ذرا سی فرصتِ غم رہ گئی ہے
ہماری زندگی کم رہ گئی ہے

سمیٹا ہے بہت لمحوں کو ہم نے
مگر یہ عمر برہم رہ گئی ہے

بہت ہے سانس کا چلنا بھی لیکن
یہ مہلت بھی کوئی دم رہ گئی ہے

کبھی تو یاس سے ملنا تھا کم کم
اور اب اُمید کم کم رہ گئی ہے۔

جو دل پر خشک سالی ہے تو حامد
ھماری آنکھ کیوں نم رہ گئی ہے

ایک دریا دھند کا ہے، ایک دریا رات کا
ایک غم دنیا کا ہے اور ایک اپنی ذات کا

آسماں، پیڑوں کے سائے، بادلوں کے عکس ہیں
جھیل کا پانی بنا ہے، آئنہ برسات کا

ہلکی نیلی ساعتوں میں چاندنی مدہوش ہے
اور میری آنکھ پر ہے لمس اُس کے ہات کا

دودھیا منظر میں جیسے سرخیٔ لب گھل گئی
اس کے گالوں پر کھِلا احساس میری بات کا

نرم ہاتھوں پر مہکتی ہے حنا کی شام سی
سوچتی آنکھوں میں گہرا رنگ ہے جذبات کا

لاہور کی حسین فضاؤں سے دور ہوں
لگتا ہے جیسے ماں کی دعاؤں سے دُور ہوں

اک دشت بے اَماں کی خموشی ہے چار سُو
شہرِ وفا کی میٹھی صداؤں سے دُور ہُوں

گُم ہوں دیارِ غیر کے اس برف زار میں
اپنوں کی پُرتپاک جفاؤں سے دُور ہُوں

گرمی کی شام، موتیا، سردی کی شب، گلاب
موسم کی دلفریب اداؤں سے دُور ہُوں

اک یاد بن کے رہ گئی سرسبز چاندنی
جب سے خیالِ یار کی چھاؤں سے دُور ہُوں

میں دُور ہُوں کسی گُل خوشرو کی آنچ سے
آنچل کی مہکی ہواؤں سے دُور ہُوں

خواب تو ایک امکان کا راستہ ہے
یہ گماں کس مسافر کا منزل نما ہے!

رات بہتی ہوئی چاندنی کا سمندر
کون، دن کے کنارے پہ یہ سوچتا ہے!

شام کی جھلملاتی ہواؤ، ٹھہرنا!
میرے دامن میں برگِ شفق گِر رہا ہے

کس کی پازیب میں کھِل رہی ہے دھنک سی
کس کی آہٹ سے رنگِ حنا پھوٹتا ہے

رات بھر جگمگاتے ہیں چشمِ فلک میں
ان ستاروں کا اشکوں سے کچھ سلسلہ ہے

درد، سینے میں اُڑتی ہوئی دھول حامد
ضبط، آنکھوں میں ٹھہرا ہوا قافلہ ہے

دل کی مُشکل، کبھی آساں نہیں ہونے دیتا
مجھ کو دشمن، تہی داماں نہیں ہونے دیتا

میری آنکھوں پہ سدا ہاتھ رہے ہیں اس کے
وہ مرے زخم نمایاں نہیں ہونے دیتا

دل گراں باریٔ احساس کا بیوپاری ہے
غم کو، بازار میں، ارزاں نہیں ہونے دیتا

لوٹ آتا ہے، وہ یادوں کے جِلو میں ہر شام
میری تنہائی کا ساماں نہیں ہونے دیتا

جمع رکھتا ہے زرِ خواب کی صورت، حامد
وہ کبھی مجھ کو پریشاں نہیں ہونے دیتا

اگرچہ نیند کی زد میں تھی زندگی میری
مثالِ خواب بکھرتی تھی روشنی میری

میں چاند ہو کے بھی ظلمت کے دائروں میں رہا
مرے ہی کام نہ آپائی، چاندنی میری

میں دُشمنوں سے نہ ملتا، تو جان سے جاتا
مرے خلاف صف آرا تھی دوستی میری

اُسے بھی خواب میں آنے کا وقت بھول گیا
مجھے بھی یاد نہیں آنکھ کب لگی میری

ندی سے پار اُترنا محال تھا، حامد
سفر طویل تھا، کشتی تھی کاغذی میری

حرفِ سحَر نشاں کا طلب گار میں بھی ہوں
گر رات جاگتی ہے تو بیدار میں بھی ہوں

سورج کے ساتھ ساتھ سفر میں ہوں، دوستو
زنجیرِ روز و شب میں گرفتار میں بھی ہوں

چلئے، تمام دھوپ ہوئی آپ کی--- مگر
تھوڑی سی روشنی کا تو حقدار میں بھی ہوں

جس آئنے میں اُترا، تِرا خواب عکس
اس آئنے میں صورتِ تکرار میں بھی ہوں

جس داستاں کا مرکزی نقطہ ہے کائنات
اس داستاں کا ثانوی کردار میں بھی ہوں

دل کو رہینِ جذبِ تگ و تاز کر لیا
ٹوٹے پروں کو مائلِ پرواز کر لیا

پیشِ نظر تھی وسعتِ دامانِ شامِ ہجر
سو ہم نے تیرے غم کو پس انداز کر لیا

اُڑنے نہ پائے طائرِ غم اس خیال سے
ہم نے دیارِ دل قفس انداز کر لیا

پلکیں اٹھیں تو دل کی صدا کان میں پڑے
جب سے نظر کو صورتِ آواز کر لیا

کس سمت جانے نقشِ جنوں دل کو لے چلے
منزل کو ہم نے نقطۂ آغاز کر لیا

جنوں کی تشنگی، زخموں کی لذت بھی نہیں ہے
سرِ دشتِ تمنا، ابرِ وحشت بھی نہیں ہے

کہاں سے ڈھونڈ لاؤں، سایۂ شاخِ محبت
کہ نخلِ شوق پر، برگِ ملامت بھی نہیں ہے

نہ جانے کیوں جلاتا ہوں دیے اپنے لہو سے
دیارِ شعر سے ایسی محبت بھی نہیں ہے

مری آنکھوں میں ٹھہرے ہیں یہ کیا بے عکس منظر
کہ اب ان آئنوں میں رنگِ حیرت بھی نہیں ہے

جلا کر جس کو، کرلوں کلبۂ جاں کو منوّر
کہ اب دل میں خس و خاشاکِ حسرت بھی نہیں ہے

میں کیسے مان لوں تیری بشارت منزلوں کی
ترے چہرے پہ تو گردِ مسافت بھی نہیں ہے

میں خود اپنے غم کے حصار ہی میں گھِرا رہا
کوئی دائرہ، مرے چاروں اور کھنچا رہا

یہ بہار تو اُسی ایک زخم کے نام ہے
جو خزاں میں بھی، مرے دشتِ جاں میں کھلا رہا

تیرے سرخ ہونٹوں سے گر کے بھی میں مٹا نہیں
کسی برگِ سبز پہ میرا نام لکھا رہا

ترا روپ، شام کی دھوپ تھا، کھلا، بجھ گیا
میں چراغِ حرفِ سوال تھا، سو جلا رہا

مری سانس میں ترا لمس اُترا نہیں کبھی
مری آنکھ نے ترا خواب دیکھا ہے بارہا

(بابا کے لیے)

گردشِ وقت کی زد میں یہ جہاں ہے کہ جو تھا
پر ترا غم، مرے سینے میں جواں ہے کہ جو تھا

شبِ تنہائی کی بجھتی ہوئی خاموشی میں
گنگناتا ہوا اک رنگِ بیاں ہے کہ جو تھا

مجھ کو دھڑکن، تیری آمد کا پتہ دیتی ہے
دل میں اب تک تیری آہٹ کا گماں ہے کہ جو تھا

لب مرے اب بھی، ترے ضبط کی تحویل میں ہیں
دل میں اب بھی تیری آہوں کا دھواں ہے کہ جو تھا

مجھ کو لگتا ہے کہ میں خود سے جدا ہوں، جیسے
کربِ فرقت میری سانسوں میں رواں ہے کہ جو تھا

زرد پتوں کی وہ بارش ہے کہ تھمتی ہی نہیں
کان میں اب بھی وہی شورِ خزاں ہے کہ جو تھا

اب زمیں پاؤں کے نیچے نہیں ٹکتی حامد
وہ توازن مرے قدموں میں کہاں ہے کہ جو تھا

میری قسمت پر نہ جانے کیا اثر راتوں کا ہے
پھر ستارے ہمقدم ہیں پھر سفر راتوں کا ہے

دن کی ٹہنی پر فسردہ رتجگوں کے پھول ہیں
نخلِ امکاں بے ثمر ہے، یہ ثمر راتوں کا ہے

دیکھئے، اُمید کی کشتی کا کیا انجام ہو!!
وقت کا اندھا سمندر اور بھنور راتوں کا ہے

روشنی سہمی ہوئی، سورج بھی کُملایا ہوا
صبح کے رُخ سے نمایاں، اب بھی ڈر راتوں کا ہے

آسماں کے نیلگوں آنچل کی سُونی وسعتیں
اور ستارے ٹانکنے والا ہُنر راتوں کا ہے

شاخِ یادِ یار کی ہر اِک کلی کھلنے لگی
یہ صبا کا ہے کرشمہ یا اثر راتوں کا ہے

وقت کی دھند میں سرمئی سا ستارہ بنے
تو مری آنکھ میں شام کا استعارہ بنے

اَن چلے راستوں کی مسافت سِمٹنے لگے
تیرا آنچل دھنک. منزلوں کا اشارہ بنے

میری کشتی بھٹکتی رہے بادلوں کی طرح
تو مری سمت آوارگی کا کنارہ بنے

ہونٹ لذت سے نا آشنا جب بھی ہونے لگیں
ذائقہ تیری یادوں کا، میرا سہارا بنے

پھر چمکنے لگیں جگنوؤں سی میری خواہشیں
پھر گلِ آرزو سے مہکتا نظارہ بنے

دھڑکن چُپ ہے، سانسوں میں سناٹا ہے
اب کے حبس تو سینے میں جا اُترا ہے

سورج بھی تھک ہار، ندی میں جا اُترا
شام ہوئی تو دن بھی گھر کو لوٹا ہے

وہی کھنک ہے، ایک کھرے سکّے جیسی
میں نے اس کو لہجے سے پہچانا ہے

دھیما دھیما سُرخ، سفید، گلابی سا
موسم ہے یا رنگ بدلتا چہرا ہے

آنکھیں ہیں شفاف، مگر جل تھل سی ہیں
دن روشن ہے، لیکن بھیگا بھیگا ہے

عُمر کی لمبی پگڈنڈی تنہا حامد
مُٹھی بھر ان یادوں سے کیا بنتا ہے!

آپ بچ جائے گا کشتی کو ڈبونے والا
یہ کرشمہ تو مری جاں، نہیں ہونے والا

ساحلِ چشم پہ موتی سے بکھرتے جائیں
کوئی دھاگہ بھی تو ہو، ان کو پرونے والا

تُم چراغ لبِ اظہار کو روشن تو کرو
رہ پہ آ جائے گا خود راستہ کھونے والا

مجھ سے ملنا تو اُسی شامِ اَبد رنگ میں تُم
شب کی آغوش میں جب وقت ہو سونے والا

معجزہ حُسنِ توکّل کا ملا ہے جب سے
ہو ہی جاتا ہے مرا کام، نہ ہونے والا

ملگجے ہاتھوں میں، اُمّید کی گڑیا دے کر
اپنی بچّی کو سُلاتا ہے کھلونے والا

یہ کیسا عجیب سانحہ ہے
اب دن بھی اندھیرے بانٹتا ہے

کرنوں کے بُنے گا جال اب کون
سورج تو غروب ہو چکا ہے

میں ضبط کا ڈھونڈتا ہوں تیشہ
ظُلمت کی فصیل کاٹنا ہے

ٹکرا ہی گیا ہوں پتھروں سے
ہر چند کہ جسم آئنہ ہے

یہ شور، درخت پر ہے کیسا
پنچھی تو کبھی کا سو چکا ہے

بھُوکا تو نہیں کوئی پڑوسی
اب کون یہ بات سوچتا ہے

حامد، مرے دور کا ہر اک شخص
آپ اپنی انا کو پوجتا ہے

ابھی پہچان کی دہلیز تک آیا نہیں ہے
وہ میرا عکس ہے، میں نے اسے دیکھا نہیں ہے

بہت خواہش ہے، جس کے روز و شب کو جاننے کی
اسے خط میں کبھی اپنا پتہ لکھنا نہیں ہے

بہت مدّت ہوئی آنکھوں نے تعبیریں چُنی تھیں
بہت مدت سے اب تو خواب بھی دیکھا نہیں ہے

بہت خاموش ہیں یادوں کے یہ سرسبز رستے
یہاں تو وقت کی آہٹ کا بھی دھڑکا نہیں ہے

یہ کیسے بوجھ سے جھکنے لگی ہے میری گردن
کبھی سر پر کوئی احسان تو رکھا نہیں ہے

مانا یہ زخم مجھ کو مقدّر سے آئے ہیں
لیکن جو تیر تیرے برابر سے آئے ہیں!

اے ربِّ شام، اس دلِ مسکیں کی خیر ہو
ہم مل کے آج پھر کسی خود سر سے آئے ہیں

یہ جو فلک پہ قوسِ قزح ہے کھِلی ہوئی
رنگِ جمال ہیں، ترے پیکر سے آئے ہیں

رستے کی دھول، پاؤں کی زنجیر ہو گئی
لگتا ہے، پھر پلٹ کے ترے گھر سے آئے ہیں

چہرے ہیں زخم زخم، تو دل ہیں لہو لہو
یہ کون لوگ، شہرِ ستمگر سے آئے ہیں

حامد، یہ میرے شعر، مرے ترجماں سہی
یہ عکس بھی تو درد کے منظر سے آئے ہیں

گماں کیوں مجھ کو دشمن کا ہوا تھا
مقابل آئینہ رکھا ہوا تھا

گزرنا جس سے تھا، جاں سے گزرنا
وہ رستہ بھی مرا دیکھا ہوا تھا

اُتارا تھا جسے کل شب، سَحَر نے
مجھے اس خواب نے پہنا ہوا تھا

چراغِ خامشی تھا اور میں بھی
سرِ بامِ نوا رکھا ہوا تھا

مثالِ حلقۂ گردِ مسافت
میں اپنے پاؤں میں لپٹا ہوا تھا

کوئی رہبر ستارہ تھا نہ جگنو
زمانہ راستہ بھولا ہوا تھا

وہ میری آخری خواہش تھا حامد
اسے یہ جان کر چھوڑا ہوا تھا

ہونٹوں پہ قفلِ ضبط تھا، کھولا نہیں گیا
یوں چُپ ہوئے کہ پھر کبھی بولا نہیں گیا

وہ رنگ تھا، کسی رخ آتش مثال میں
سورج سے بھی شفق میں جو گھولا نہیں گیا

آتش بجاں ہوں سرد طبیعت کی اوٹ میں
وہ راکھ ہوں کہ جس کو ٹٹولا نہیں گیا

شامِ ستم شعار کی اندھی ہواؤں میں
وہ کاٹ تھی پروں کو بھی تولا نہیں گیا

اک اشکِ نارسائی ہوں، چشمِ فراق میں
خاکِ وصال میں جسے رولا نہیں گیا

جتنے تھے یاد اسم، سبھی آزما لئے
وہ در جو بند تھا اسے کھولا نہیں گیا

جو موسم بیت جاتا ہے دوبارہ کیوں نہیں آتا
کہیں سے لوٹ کر بچپن ہمارا کیوں نہیں آتا

یہاں آنے کو تو ہر دن کسی کے ساتھ آتا ہے
جسے اس دل نے رہ رہ کر پکارا کیوں نہیں آتا

وہ جس کی لو محبت کی جبیں کا استعارہ تھی
تو پھر رستے میں وہ روشن ستارا کیوں نہیں آتا

بہت حیرت ہے، اب باغوں میں جب کلیاں چٹکتی ہیں
ہمارے دھیان میں. لہجہ تمہارا کیوں نہیں آتا

کبھی بھیگے ہوئے پیڑوں سے جب کرنیں جھلکتی ہیں
تصور میں ان آنکھوں کا اشارہ کیوں نہیں آتا

بھٹکتا پھر رہا ہوں دن کے اس ویران جنگل میں
مہکتی شام کا رنگیں کنارا کیوں نہیں آتا

بے کراں کوئی بھی منظر نہیں دیکھا جاتا
اب ان آنکھوں سے سمندر نہیں دیکھا جاتا

کیسی وسعت، مرے دامانِ نظر میں آئی
اپنی ہی ذات سے باہر نہیں دیکھا جاتا

تکتے رہتے تھے، جسے روز و شبِ ہجر میں ہم
اب اسی رہ کو پلٹ کر نہیں دیکھا جاتا

راکھ ہونے پہ بھی احساس کی لَو باقی ہے
بجھی آنکھوں سے جلا گھر نہیں دیکھا جاتا

یہی موسم ہے پکی فصل کے کٹ جانے کا
اپنے کاندھے پہ بھی اب سر نہیں دیکھا جاتا

عشق کرنا ہے تو پھر خوف کے پہلو سے نکل
اس تعلق میں کوئی ڈر نہیں دیکھا جاتا

وہ بڑی چھب سے پسِ دار کا منظر کھینچیں
اور ہم سے تو پسِ در نہیں دیکھا جاتا

گھر سے وہ نکلی ہے یوں پیلا دوپٹہ اوڑھ کر
چاند نکلے جس طرح چہرے پہ ہالہ اوڑھ کر

ان دنوں دل کا جزیرہ اس طرح ویران ہے
خشک دریا سو رہا ہو، جیسے صحرا اوڑھ کر

تھا کہاں اس دشتِ غربت میں وفا کا سائباں
سو رہے ہم دھوپ میں، اپنا ہی سایہ اوڑھ کر

یوں چمکتی ہے تری خواہش، مری پہچان میں
جیسا نکلا ہو کوئی تن پر ستارہ اوڑھ کر

بنتِ حوّا بڑھ رہی ہے، دورِ ماضی کی طرف
کل پھرے گی دیکھ لینا، ایک پتہ اوڑھ کر

حامد اک سے ایک بڑھ کر ہے یہاں بہروپیا
کون پھرتا ہے، نہ جانے کس کا چہرا اوڑھ کر

شکستِ خواب کے منظر ابھی نظر میں ہیں
بَلا کے عکس مری آنکھ کے بھنور میں ہیں

یہ کس کے پاؤں سے لپٹی ہے رہگزر کی تھکن
سفر میں کون ہے یہ، ہم تو اپنے گھر میں ہیں

کسے خبر، وہ اماوس کی شب میں آ جائے
چراغ، طاقِ رہِ شامِ منتظر میں ہیں

فضائے عصر میں اُڑتا ہوا پرندہ ہوں
ہوا کے رنگ چھُپے میرے بال و پر میں ہیں

تراشتا ہے شب و روز، رنگ رنگ کے غم
کئی کمال مِرے دستِ بے ہُنر میں ہیں

بجھی بجھی سی ہیں کرنیں، اُداس اُداس فضا
شبِ گذشتہ کے آثار ابھی سحر میں ہیں

بہارِ جاں فزا کے بعد کیا ہے
شجر پر اک پرندہ سوچتا ہے

رواں ہیں سانس کی لہریں ازل سے
یہ دریا دھیرے دھیرے بہہ رہا ہے

اگر ملنا تمہارا وہم سا تھا
بچھڑنا بھی تمہارا خواب سا ہے

میں جس میں زندگی کا عکس دیکھوں
تمہاری آنکھ ایسا آئنہ ہے

بہت ہی پر سکوں تھی جھیل دل کی
یہ اس میں کون پتھر پھینکتا ہے

ستارے کس کی گردِ رہ بنے ہیں
فلک سے چاند کس کو جھانکتا ہے

حکایت ہو کسی کے غم کی حامد
مجھے لگتا ہے میرا تذکرہ ہے

گُنگ ہے راستہ، ہم بھی خاموش ہیں
سُن بھٹکتی ہوا، ہم بھی خاموش ہیں

اُس کے عکسِ حسیں کو بھی، چُپ سی لگی
صورتِ آئنہ، ہم بھی خاموش ہیں

سو گیا صبح کی آنکھ میں رتجگا
بجھ گیا ہر دیا ہم بھی خاموش ہیں

کیسے دیوانگی، چاندنی میں ڈھلی
کون بتلائے گا، ہم بھی خاموش ہیں

آسماں بھی شفق سے پشیمان ہے
دیکھ رنگِ حنا، ہم بھی خاموش ہیں

کب تلک کوئی چلتا رہے گا بھلا
تھک گیا حوصلہ، ہم بھی خاموش ہیں

کوئی جھونکا نہیں، کوئی شعلہ نہیں
تُو بھی چُپ ہے صبا، ہم بھی خاموش ہیں

قصور وار ہیں سب اعتراف کون کرے
سزا کا فیصلہ اپنے خلاف کون کرے

بڑے خلوص سے ملتے ہیں، ظاہراً سب دوست
کسی کے دل میں ہے کیا، انکشاف کون کرے

ہزار تلخ سہی، ذائقہ حقائق--- کا
حقیقتوں سے مگر انحراف کون کرے

کھڑی ہے راہ میں کُہنہ روایتوں کی فصیل
ہے کس میں حوصلہ، اس میں شگاف کون کرے

ہو صاف آئنہؑ دل، تو کچھ نظر آئے
اس آئنے سے مگر، گرد صاف کون کرے

محاسبہ بھی ضروری تو ہے مگر حامد
خود اپنے آپ کو، اپنے خلاف کون کرے

بھڑک اُٹھنے کی دُھن میں رات دن بے تاب رہتا ہے
چراغِ شامِ تنہائی، سحر آداب رہتا ہے

جہانِ شب گزیدہ کے مکیں، اے صبح کے طائر
میں کیونکر کھول دوں آنکھیں، ابھی اک خواب رہتا ہے

گزرنے کو تو میں اک قلزمِ خوں سے گزر آؤں
مگر پیشِ قدم اک خطۂ پایاب رہتا ہے

سرِ بحرِ یقیں، ریگِ گماں کی سرسراہٹ تھی
تہِ صحرائے امکاں بھی کوئی گرداب رہتا ہے

یہ کیسے رت جگوں میں ہو گئیں بوجھل مری آنکھیں
یہ کس کے خواب میں گم، دیدۂ بے خواب رہتا ہے

نئے امکاں کے برگ و بار دیتا ہے ہر اک موسم
کوئی رُت ہو، مرا نخلِ سخن شاداب رہتا ہے

ابھی توڑیں نہ چُپ کو، لفظ کی حُرمت کو پہچانیں
کتابِ خامشی کا آخری اک باب رہتا ہے

اسے چبھنے لگیں کیوں دھوپ کی جلتی ہوئی کرنیں
ترا حامد تو زیرِ چادرِ مہتاب رہتا ہے

حقیقتوں سے کوئی رابطہ، نہیں رکھتے
یہ لوگ پیشِ نظر آئنہ نہیں رکھتے

ہم اہلِ شوق عجب شان کے مسافر ہیں
کہ چل رہے ہیں مگر راستہ نہیں رکھتے

نہ آرزوؤں کا جمگھٹ، نہ خواہشوں کا ہجوم
ہم اپنے ساتھ کوئی قافلہ نہیں رکھتے

ہر ایک زخم کو دل سے لگا کے رکھتے ہیں
مگر لبوں پر کسی کا گلہ نہیں رکھتے

کبھی تو اس سے بچھڑنا محال لگتا تھا
اب اس سے ملنے کا بھی حوصلہ نہیں رکھتے

نظر میں ہے کمان میں نہیں ہے
نشانہ دید بان میں نہیں ہے

کشش ہی آسمان میں نہیں ہے
کہ حوصلہ اُڑان میں نہیں ہے

ملا ہے، دشت میں سکوں جو دل کو
وہ شہر کے مکان میں نہیں ہے

چلا ہے کوہکن جو کھودنے کو
وہ نہر تو چٹان میں نہیں ہے

یقیں کوہ ہو وہی اساس شاید
جو شے ابھی گمان میں نہیں ہے

سانس لینے کے لئے کچھ راستہ رکھنا پڑا
قربتوں میں بھی ذرا سا فاصلہ رکھنا پڑا

ورنہ ہم تو کٹ چکے تھے رنگِ وصل و ہجر سے
اُس کی خاطر موسموں سے رابطہ رکھنا پڑا

ختم ہوتا ہی نہ تھا سکتہ طلسمی آنکھ کا
ہم کو حیرت کے مقابل آئنہ رکھنا پڑا

جب ہوائے غم کے ہاتھوں رختِ ہجرت لُٹ چکا
ہم کو ان ٹوٹے پروں میں حوصلہ رکھنا پڑا

کاٹ ڈالی ضبط سے، ہر ایک زنجیرِ طلب
یوں بھی قائم دوستی کا سلسلہ رکھنا پڑا

جس ستمگر کو خوش آتی تھیں سدا ناراضیاں
اس کی خاطر ہم کو بھی لب پر گِلہ رکھنا پڑا

ہم کو بھی حامد، کسی گہرے سمندر کی طرح
خامشی کی اوٹ میں اک حادثہ رکھنا پڑا

وہ ایک شخص کہ جس سے محبتیں تھیں بہت
خفا ہوئے تو اسی سے شکائتیں تھیں بہت

بہت عزیز تھے اپنے اُصول اس کو بھی
ہمیں بھی اپنی انا کی ضرورتیں تھیں بہت

جو تتلیوں کے پروں پر سجی ہیں بن کے دھنک
ہمارے پیار میں ایسی بھی ساعتیں تھیں بہت

ہمارے لب پہ، نہ اُس کی زباں پہ حرف کوئی
مگر نگاہوں میں لکھی، حکائتیں تھیں بہت

اداس ہم تھے، تو وہ بے قرار کم تو نہ تھا
ہمارے پیار میں حامد، صداقتیں تھیں بہت

بظاہر اس سے مرا کوئی رابطہ بھی نہیں
مگر یہ کیا ہے کہ دل اُس کو بھولتا بھی نہیں

وہ ایک چہرہ مجھے چار سُو دکھائی دے
اگرچہ دُور تلک کوئی آئنہ بھی نہیں

یہ کیسی رُت ہے کہ اب خواب بھی ہوئے نایاب
اور اپنی آنکھ میں اب کوئی رَت جگا بھی نہیں

وہ دور ہو کے بھی رہتا ہے آس پاس مرے
گریز پا ہے مگر وہ گریز پا بھی نہیں

میں سوچتا ہوں کہ اس سے نہ اب مِلوں حامد
ملے بغیر مگر کوئی راستہ بھی نہیں

پانی، ندی، کنارا، تنہا تنہا ہے
میں نے جس کو دیکھا تنہا تنہا ہے

دور دور تک ناؤ نہیں کوئی خوابوں کی
آنکھوں کا یہ دریا تنہا تنہا ہے

میں تنہا پھرتا ہوں، شہر کی سڑکوں پر
سر پر ایک ستارہ، تنہا تنہا ہے

دیکھیں تو رشتوں کے کتنے میلے ہیں
سوچیں تو ہر بندا تنہا تنہا ہے

یادوں کی لہریں ہیں اور نہ سایہ غم
دل کا خشک جزیرہ، تنہا تنہا ہے

جنگل پر چھایا ہے کیسا سناٹا!!
ہر پودا، ہر سایہ، تنہا تنہا ہے

یوں تو ہے مربوط، سمے کا جال بہت
لیکن لمحہ لمحہ، تنہا تنہا ہے

دل نے کیا کیا نہ سانحے دیکھے
اس کی قربت میں فاصلے دیکھے

دیکھنے کو تو خواب تھے کیا کیا
میری آنکھوں نے رت جگے دیکھے

ایک مدّت کے بعد سوچا ہے
ایک مدّت ہوئی اسے دیکھے

دیکھ کر اس کی چشمِ حیراں کو
ہم نے حیرت میں آئنے دیکھے

شامِ غم میں، کنارِ چشمِ فلک
ہم نے اشکوں کے سلسلے دیکھے

وہ تو منزل کو پا چکا حامد
جس کے اک عمر راستے دیکھے

اُس پنچھی کی منزلِ جاں تک کیسے بھلا رسائی ہو
جس کے مقابل تیز ہوا نے اک دیوار اٹھائی ہو.

جاگتے میں بھی پلکوں پر خوابوں کی دھند سی رہتی ہے
جیسے میری آنکھوں میں صدیوں کی نیند سمائی ہو

خواب میں اُجلے اُجلے گھر تھے، روشن روشن گلیاں تھیں
آنکھ کُھلی تو دیکھا، جیسے شہر میں آندھی آئی ہو

سچ لکھنے بیٹھوں تو اکثر ہوتا ہے محسوس یہی
جیسے ذہن نہیں ہے اپنا، جیسے سوچ پرائی ہو

سُوکھی مریل شاخ پہ ننھی کونپل آنکھیں ملتی ہے
پت جھڑ جیسے رنگ بدلتے موسم کی انگڑائی ہو

سوچوں کے کشکول میں کچھ اندیشے کچھ امیدیں ہیں
جیسے میرے جیون بھر کی حامد یہی کمائی ہو

نجدِ امکاں سے کسی یاد کا محمل گزرے
چشمِ بے خواب سے وہ خواب شمائل گزرے

ہاتھ کشکولِ گدا تھے، نہ نظر دست سوال
بے سبب تیری گلی سے، تیرے سائل گزرے

چاند ٹھہرے رُخ و عنوانِ حیات نو کا
کاش یہ رات سرِ کوچۂ قاتل گزرے

دِل تھکے ہارے مسافر کی طرح بیٹھ گیا
جادۂ شوق میں ایسے بھی مراحل گزرے

میری آنکھوں میں سِمٹ آئے شفق رنگِ خیال
آئنے، جب بھی چراغوں کے مقابل گزرے

وقت کی تیرگی اوڑھ کر
ہم جئے زندگی اوڑھ کر

سو گئے ہیں خزاں میں شجر
زرد رو چاندنی اوڑھ کر

چاند دریا میں بہتا رہا
رات کی خامشی اوڑھ کر

کھو گیا وقت کس راہ میں
یاد کی دھند سی اوڑھ کر

پھول سانسوں میں کھلنے لگے
کن لبوں کی ہنسی اوڑھ کر

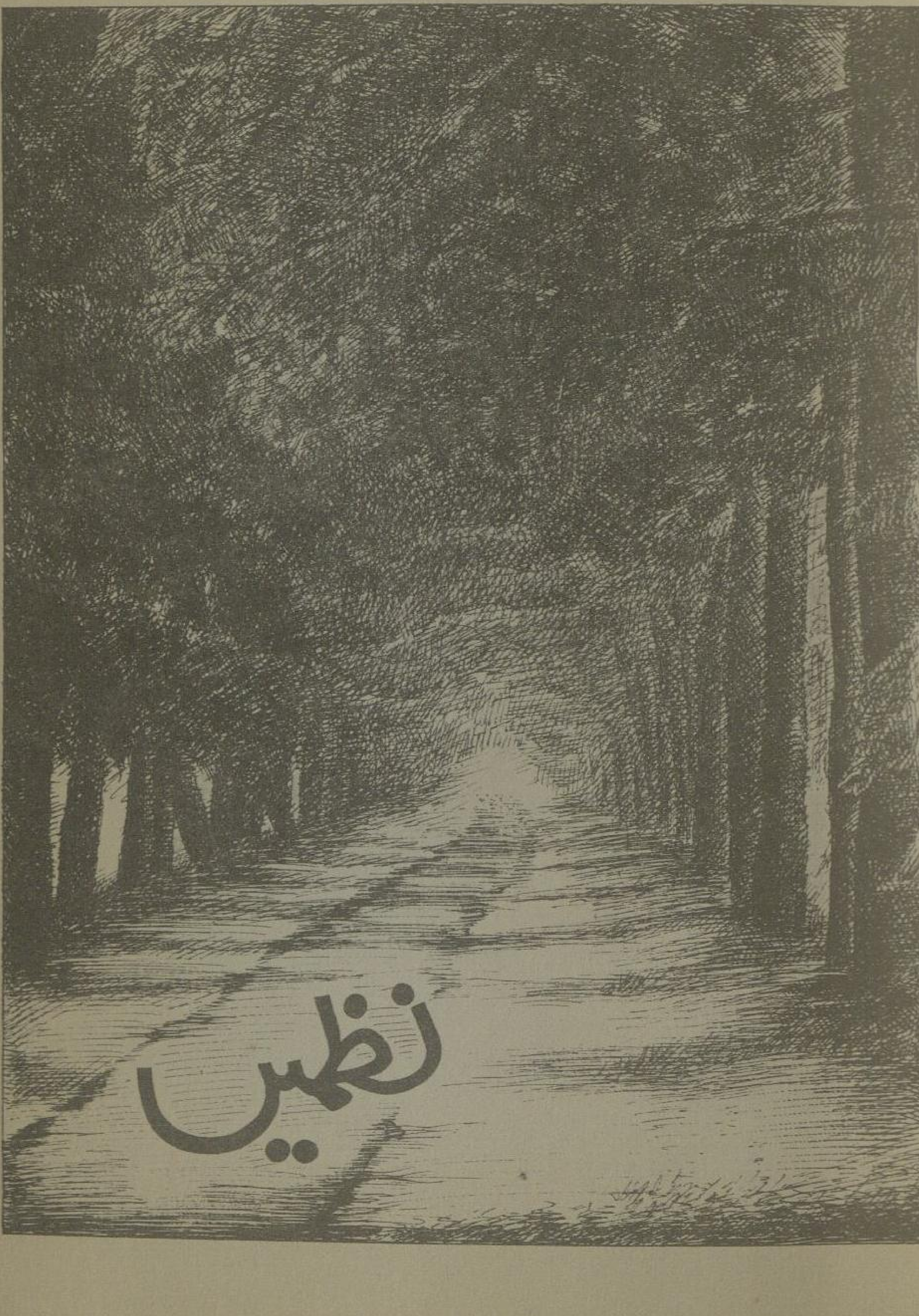
چاند آنکھوں میں اتارا جائے
پھر سمندر کو پکارا جائے

گوشۂ شب بھی گریزاں ٹھہرا
اب کہاں وقت گذارا جائے

میرے ہمراہ چلے غم، جیسے
ناؤ کے ساتھ کنارا جائے

شام کو، صبح کا منظر جائے
بکھری زلفوں کو سنوارا جائے

سوچتا ہوں سرِ منزل حامد
کیسے اس جیت کو ہارا جائے


نظمیں

ایک طویل مختصر ملاقات

یہ میری وقت سے آخری گفتگو ہے
(گفتگو ہے)
مگر بات اُلجھی ہوئی رہگذر کی طرح بڑھ رہی ہے
کون جانے کہاں ختم ہو!

اگر فُرصت مِلے تو

سُنا ہے تم بہت مصروف ہو
مصروف بھی اِتنے کہ فرصت تم سے ملنے کو ترستی ہے
سنو!
مصروفیت کے دائرے کو پاٹ کر
فرصت سے ملنے کا کبھی موقع ملے تو
سب سے پہلے خود سے ملنا

پھر فراغت کا کوئی لمحہ بچے تو
غم کے نم آلود رستوں پر کہیں سے دھوپ لا رکھنا
بھٹکتی شام کی پُروا کے دھیمے گیت سُننا
آہٹوں کی تِتلیوں کے رنگ چُننا
بادلوں کی سرسراہٹ میں مچلتی خواہشوں کے خواب بُننا
بارشوں کی دھند میں چھپتے ہوئے منظر سے تصویریں بنانا

پھر بھی گر فُرصت کی پونجی بچ رہے تو
آئینہ رُو ساعتوں کے عکس آنکھوں میں سجانا
وقت کے ساحل پہ گیلی ریت سے اک گھر بنانا
ہاتھ کی محراب سے، دل کے دیئے کی تھرتھراتی لو کو
بجھنے سے بچانا
پیڑوں کے دامن سے لپٹی چھاؤں میں مہکی ہوئی باتیں چھپانا
اور پرندوں کی چہک سے نظم کے مصرعے بنانا
یا پروں کی اوٹ سے چھنتی ہوئی کرنوں سے یادوں کی دھنک میں
رنگ بھرنا

کچھ نہیں تو
کاسنی پھولوں کی صورت، من کے سُونے پن میں کھِلنا
پھر بھی گر فرصت ملے تو
مجھ سے ملنا

برف کا آدمی

اے مرے برف کے آدمی!
تمہاری چمکتی، دمکتی ہوئی زندگی کتنی ہو گی؟
فقط ایک بارش!
فقط ایک دھوپ!

یہ کیسا ستم ہے
یہ پانی، یہ گرمی، جو میرے لئے زندگی ہیں
تمہارے لئے موت ہیں

تمہی کچھ بتاؤ-----
تمہیں کیوں بنایا گیا ہے
فقط کھیلنے کے لئے-----

اپنی خواہشوں کی تکمیل کے واسطے!

تمہیں کیا پتہ ہے
سوچتا ہوں
مجھے کیا پتہ ہے
مجھے کیوں بنایا گیا ہے
فقط زندگی کے لئے
بہتی سانسوں کی تکمیل کے واسطے!

تم تو بارش کی بُوندوں میں
سورج کی اُجلی حرارت میں جل کر پگھلتے ہو
میں اپنی سوچوں کی اندھی تپش سے گُھلا جا رہا ہوں
سلگتی ہوئی جستجو کے بدن میں جلا جا رہا ہوں
سوچتا ہوں
تمہیں کیوں بنایا گیا ہے
مجھے کیوں بنایا گیا ہے؟

فیصلے سے ذرا دیر پہلے کی نظم

اے مری ہمنشیں!
تم گئی رات کی سرد یادوں کو دھو کر
نئے دن کی مہکی ہوئی دھوپ کو اپنے آنچل میں بھر لو
سُنو!
زندگی آج ہے، کل نہیں ہے
یہ سانسوں میں چلتی ہوئی لے ہے
ٹھہرا ہوا پل نہیں ہے
اگر تم حسیں شام کو، اس زمانے کی اُلجھی ہوئی
گفتگو میں بتانے کی کوشش کرو گی
تو بے کیف لمحوں کی اُڑتی ہوئی گرد سے عمر اٹ جائے گی
کل، انھی ساعتوں کی بھٹکتی ہوا
وقت کے زرد آنگن میں کھو جائے گی
یا کبھی گیت بن کر سفیدے کے اُجڑے درختوں سے

ٹکرائے گی
ہاں کدورت کی بدلی تو چَھٹ جائے گی
مگر شام کٹ جائے گی
اس لئے، اے میرے ہمنشیں!
تم گئی رات کی سرد یادوں کو دھو کر
نئے دن کی مہکی ہوئی دھوپ کو اپنے آنچل میں بھر لو
کہ یہ زندگی، آج ہے، کوئی بیتا ہوا کل نہیں ہے

تُم جو آجاؤ

ہم مہکتی ساعتوں کے پھُول چُن لیں
شام کی بہکی ہوا کو کاٹ کر رستہ بنالیں
آنکھ میں بکھرے ہوئے خوابوں سے اک منظر بُنیں
اونگھتے پیڑوں کی چھاؤں میں چلیں
بھیگتی راہوں میں، یادوں کو کھِلادیں
ملگجی مٹی کی خوشبو اپنی سانسوں میں بسالیں
دھیمی دھیمی چاندنی کے لمس کو محسوس کرلیں
ٹھنڈی ٹھنڈی دھوپ آنگن میں بچھالیں
میٹھی میٹھی خامشی لب پر سجالیں
گنگناتی آہٹوں سے دل کا سونا پن مٹادیں

سب بھُلادیں !

تم جو آجاؤ

ہمسفر

جانے کس کی یاد میں کھوئی ہوئی کلیوں کی خوشبو
جھیل میں بھیگے ہوئے لمحوں کے عکس
بے تکلف دھوپ کی اُجلی شرارت
ہلکی پیلی شام کی مدھم ہوا
زرد رُو سبزے کی بجھتی خامشی
سنسناتی بارشوں میں ادھ کھلے پھولوں،
کھُلی چھتری سے ٹکراتی ہوئی بوندوں کی رِم جھم
رات کے پہلو میں شرماتی ہوئی
خود میں سمٹتی چاندنی
بند مُٹھی کے کسی کونے سے چھنتی
جگنوؤں کی جگمگاہٹ
تم ----- تمہارے خواب کی آہٹ
سب مری تنہائیوں کے ہمسفر ہیں

اُس سے مِلنا ہو تو کہنا

اے حسیں شام کی مدہوش ہوا
اس سے ملنا ہو تو، کہنا
کہ چہکتے ہوئے خوش رنگ پرندوں کے یہ گیت
رنگ پھولوں کے چُراتی ہوئی ساون کی دھنک
اَدھ کھلی دھوپ میں نہلائی مہکتی راہیں
اور راہوں پہ جھکے سوچتے پیڑ
ایک دوجے میں اُلجھتی ہوئی بے خود شاخیں
جھیل سے پار مہکتا ہوا روشن سبزہ
نیلگوں دُھند میں لپٹتے ہوئے رِم جھم منظر
جاگتے سوتے بہکتے موسم

اس کی یادوں کو، مرے دل میں جگاتے تو نہیں
کوئی میٹھی سی دبی آگ جلاتے تو نہیں

اے حسیں، شام کی مدہوش ہوا
اُس سے ملنا ہو تو کہنا نہیں
کچھ بھی اس سے

سانتا کلاؤس سے دُوسری ملاقات

یہ کس کے سال بھر کے خواب کی تعبیر
گھر کی کھڑکیوں میں جگمگاتی ہے

تمہاری اجنبی مُکان میں کیوں رَبطِ خاطر ہے
تمہارے ہاتھ کیسی برف باری سے چمکتے ہیں
تمہاری سُرخ جیبوں میں یہ کس کی یاد رہتی ہے---!

کہاں سے تم اچانک پھر سے سڑکوں پر
گھروں کی کھڑکیوں میں اور دکانوں کے حسیں، رنگین
شوکیسوں میں آجاتے ہو
اور پھر سال بھر جیسے صنوبر کے کسی جنگل میں چھُپ جاتے ہو
بولو، سبز رُو شاخِ صنوبر پر
یہ تحفے کس کی خاطر ہیں---؟

تمہارے ہاتھ سے گرتے ہوئے تھیلے میں کس دنیا کے قصے ہیں
کہ جن کی اک ذرا آہٹ سے
بچے چونک جاتے ہیں
دکھاؤ، کن جہانوں کی تمنا دل میں رکھتے ہو---

یہ تم کیا بانٹتے پھرتے ہو
نا آسودگی کی رات میں لپٹے ہوئے لمحوں میں
تم کیا بانٹتے پھرتے ہو
چنگاری؟
کہ بادوں کے جلو میں جھلملاتی ریشمی باتیں
تم اپنی آنکھ کی مہکی شرارت کو
بجھارت کیوں بناتے ہو!
یہ کیسی خواہشوں کی نرم بارش میں نہاتے ہو
کہو، اس سبز رو شاخِ صنوبر پر یہ تحفے کس کی خاطر ہیں
تمہاری سرخ جیبوں میں یہ کس کی یاد رہتی ہے-----!

سال کی پہلی نظم

پھر طلوعِ سالِ نو ہے
پھر وہی یادوں کی دھندلی رہگذر ہے
دُھند میں لپٹے ہوئے
کچھ عکس ہیں، کچھ نام ہیں
اور صبحِ وارفتہ کی آنکھوں میں
گئے کل کے شکستہ خواب ہیں

شبِ رفتہ کے اندیشوں کا سرمایہ
اثاثہ مہلتِ غم کا
نصیبِ صبحِ نو ہونے لگا ہے

پھر وہی کچھ آشنا لمحوں کی بے حس اجنبیت
سانس میں گھُلنے لگی ہے

کہ تازہ سال کی کھڑکی،
گذشتہ سال کے، بوسیدہ اُجڑے لان میں
کھلنے لگی ہے

پھر طلوعِ سالِ نو ہے
پھر وہی یادوں کی دھندلی رہگذر ہے

دریائے رائن کے کنارے

یہ رائن کی مچلتی، گنگناتی ریشمی لہریں
حسیں یادوں کے، جل تھل موسموں کے خواب بُنتی ہیں
سہانی شام کے جگمگ مناظر سے پگھلتے عکس چنتی ہیں
مہکتے شہر کی، بہکی ہوئی یہ نرم رو نیلی ہوائیں بھی
کسی کے لمس کا اک مخملیں احساس پہلو میں لئے ہیں
مرے سلوٹ بھرے ماتھے سے ٹکراتے ہوئے
نا آشنا جھونکے
مرے ہمراز بننا چاہتے ہیں
مرے قدموں سے ٹکراتی ہوئی
یہ دائرہ در دائرہ لہریں
کسی ٹوٹے ہوئے وعدے کی، زنگ آلود زنجیروں کی صورت
مرے پاؤں پکڑتی ہیں
کسی پیمانِ فردا کی تمنا ہیں
مگر، میں، بے وفا----- سیماب پا
لفظوں کا بیوپاری
بَھلا اِن اجنبی لہروں سے کیا وعدہ کروں!

وقت کے جنگل میں

گھرے گھنے جنگلوں میں کہیں
دل کے تاریک، خاموش گوشوں میں
روشن سمے کے مہکتے پلوں میں
کہ سر سبز پیڑوں کی ڈھلتی ہوئی
چھاؤں میں
ان اداسی سے جھکتی ہوئی
ٹہنیوں میں
چھکتے ہوئے راستوں میں
مچلتی ہوئی دھوپ کے آئینے سے
چمکتے ہوئے پانیوں میں

انہیں بے کنار ادنوں کی اُلجھتی ہوائیں
بھٹکتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی سی
اک رہگذر میں
مرے ہمسفر!
میں تری یاد گُم کر رہا ہوں

تجھے کس نے کہا تھا!؟

اری او سبز شہزادی
تجھے کس نے کہا تھا
پیڑ سے نیچے اُتر
اور شہر کی اندھی بصارت کی امیں
کالی سڑک پر دوڑ کر
نظّارۂ عہدِ زیاں کر
تعجب کیا،
کہ اب اس شام تک، تیرا لہو بھی
اس سڑک کی بے حسی میں گھُل چکا ہو گا
اشارہ کھل چکا ہو گا

لفظوں کا فُسوں

ہم تو بس لفظ جلانے کا فُسوں جانتے ہیں
ہم نہیں جانتے
جلتے ہوئے الفاظ، ٹھٹھرتے ہوئے جذبوں کو
تپش دیتے ہیں!
مُنجمد فکر کو، بے جان حقیقت کو
تمازت کی رَمَق دیتے ہیں!
کپکپاتے ہوئے خوابوں کو، تھکی سانوں کو
کچھ حرارت کی خبر دیتے ہیں!

ہم نہیں جانتے جلتے ہوئے لفظوں کا اثر
ہم تو بس لفظ جلانے کا فُسوں جانتے ہیں

ماں کے نام

کڑی گرمی کی دوپہروں میں
کالی گھور سڑکوں پر

کوئی بادل کا ٹکڑا میرے سر پر
چھاؤں تانے تو
مجھے تیری دعائیں یاد آتی ہیں

مجھے دیکھو

میں نادیدہ ستارہ ہوں
مری کرنیں فضا میں گرد کی صورت
بکھرتی ہیں
مرا ماحول، اک تاریک ہالے کے
اثر میں ہے
مجھے مادر ستارے کی کشش نے
دائرے کی قید بخشی ہے

مدارِ بے یقینی سے نکلنے کا کوئی رستہ نہیں ہوتا
میں کس خورشیدِ سنگ آثار کا
جلتا شرارہ ہوں---!
میں کم آثار، نادیدہ ستارہ ہوں
مجھے دیکھو----

یہ کیا سانحہ ہے!

گئے وقت کی زد میں آئے، پُرانے محل کی اُجڑتی فصیلیں
فصیلوں سے جھڑتا پلستر
منقش در و بام کے ساتھ چمٹی ہوئی سبز کائی
زنگ آلود چوبیں ----- بجھے طاقچے
تیز رو بگھیوں سے تہی اصطبل
آہٹوں سے، کسی چاپ سے ناشناسا مناظر
ہری تازگی کو ترستے ہوئے زرد دالان
باغوں میں خوشبو نہیں
گرد ہی گرد ہے
غیر آباد، ویراں جھروکے
جھروکوں سے لپٹی ہوئی بے بسی
تیرگی میں اُترتی ہوئی راہداری
ستونوں سے سر کو پٹختی ---- بھٹکتی ہوا

خامشی---!

سرسراہٹ----

صدا----

"کون ہے---؟"---"کون ہے---"

میں نہیں ہوں، تو پھر کون ہے---!

ایک خوابیدگی سے اُلجھ کر پلٹتی ہوئی یہ صدا

یہ تو شاید، مریٰ ہی صدا ہے
مگر کس قدر اجنبی---!

اپنے ماضی میں، شاید
میں اپنے لئے اجنبی ہوں
مرا آج، اپنے ہی بیتے ہوئے کل سے کتنا جدا ہے--!
مرا جسم اپنے ہی چہرے سے نا آشنا ہے
یہ کیا سانحہ ہے----!

چلو واپس چلیں

تمہیں خواہش کو چھونے کی تمنا ہے!؟

خواہشیں تو اُڑتی پھرتی تتلیاں ہیں
ڈاک کی ناکارہ ٹکٹیں تو نہیں ہیں
جنہیں البم میں رکھ کر تم یہ سمجھو
کہ یہ نایاب چیزیں اب تمہاری دسترس میں ہیں

تمہیں سپنے پکڑنے کی تمنا ہے!؟

نہیں، یہ غیر ممکن ہے
کہ سپنے اَن چھوئے لمحوں کے نازک عکس ہیں
آرائشی بیلیں نہیں،
جو کمرے کی کسی دیوار پر سج کر

تمہاری دید کا احساں اُٹھائیں

تمہیں کُہرے کے بھیگے پھول چننے کی تمنا ہے!؟

یہ کُہرا تو چراغِ موسمِ گل کا دھواں ہے
کوئی دیوارِ برلن پر کھنچی تحریر یا نقشہ نہیں
جسے، جس وقت جو چاہے بدل دے
یا مٹا دے
سبز رُو کہرا پکڑنا اس قدر آساں نہیں
سُنو!
دیوانگی چھوڑو
چلو واپس حقیقت میں چلیں

دشتِ حیرت میں اِک نظم

بگولوں کی حقیقت صرف اتنی سی ہے یزدانی
ہمارے دل کی وحشت دوشِ صحرا پر سوار آئی
(یزدانی جالندھری)

یہ کس دنیا کا نقشہ ہے
یہ کس عہدِ وصال و ہجرِ جاناں کا تماشا ہے
نہاں ہے کون منظر میں
خبر کے پیش منظر میں
نظر کی دُھند میں خوابیدہ پس منظر کی حیرت میں
نہاں ہے کون حیرت میں
یہ کیسے ابر زادے ہیں
کہ صدیوں کے سلگتے دشتِ امکاں پر کبھی کُھل کر نہیں برسے

غمِ ماضی گریزاں ہے
غمِ فردا بھی جیسے ایک نقشِ بے یقینی ہے
مگر یہ کیسا نقشہ ہے
مگر یہ کیا تماشا ہے
وہی عکسِ رُخِ جاناں
وہی رقصِ دلِ بسمل
وہی چھن چھن سلاسِل کی
نہ جانے کون ہیں ہم
کس طرف جانے کی ٹھانی ہے
فریب خواب ہیں
یا پھر کسی خواہش کا دھوکا ہیں
نہ جانے کون ہیں کیا ہیں
یہ کیسی پیش قدمی ہے
کہ ہم آغاز سے سانسوں کی پسپائی کے درپے ہیں
ہجومِ عمر میں
اس دِل کی تنہائی کے درپے ہیں
یہ کس دنیا کا نقشہ ہے
یہ کس عہدِ وصال و ہجرِ جاناں کا تماشا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا

نوکیلے خواب

میں نے دل کے آئینے میں
خواب جڑے تھے
لیکن سارے ریزہ ریزہ بکھر گئے ہیں
(یادیں بن کر)
تیرے گھر کے آنگن میں

کِرچی کِرچی، کون انہیں اب جوڑے گا!
کون اپنے نازک ہاتھوں کو
خون میں رنگنا چاہے گا!
(سب کو خبر ہے)
خوابوں کے نوکیلے ٹکڑے
گر ہاتھوں میں چُبھ جائیں تو
آنکھوں سے بھی خوں بہتا ہے

فاختہ اکیلی ہے
(ترائلے)

پر بریدہ اُڑتی ہے زرد رُو گھٹاؤں میں
جبر کی فضاؤں میں، فاختہ اکیلی ہے
کاٹ ہے زبانوں سی، بے اماں ہواؤں میں
پر بریدہ اُڑتی ہے زرد رُو گھٹاؤں میں
دب گئی ہیں سب چیخیں بے نوا صداؤں میں
زندگی کے جنگل میں موت کی سہیلی ہے
پر بریدہ اُڑتی ہے، زرد رُو گھٹاؤں میں
جبر کی فضاؤں میں فاختہ اکیلی ہے

شاید

چلے گی جب ہوا اگلے برس

برسات آنے پر

شجر کے دوش پر بھیگے ہوئے

پتوں کے جھُرمٹ میں

کرن کے

مسکرانے پر کرن گے

تمہیں ہم، یاد بھی شاید نہ آئیں----!

سیلاب زدہ

سڑک پر بسی، بستیو
تم گواہی نہ دو
آسماں سے جھکے بادلو
تم گواہی نہ دو
زمیں پر بپھرتے ہوئے پانیو،
اَبد کی طرف گامزن قافلو
چاہے، تم بھی گواہی نہ دو

مگر، ماں کی چھاتی سے لپٹا، وہ معصوم بچہ تو
یہ کہہ سکے گا،
کہ اب ماؤں کا دودھ بھی گرد آلود ہے---

جنگ

پھر وہی بارُود میں جُھلسی ہَوا
سانسوں کو شَل کرتی ہوئی
امن کی ریشم رگیں مفلوج کرتی جارہی ہے
فاختہ کے پھول سے دل میں دہکتی سسکیوں کی
راکھ بھرتی جارہی ہے

جب بموں کے برق زا،
اندھے دھماکوں میں
قیامت آشنا، اک شور اُٹھتا ہے
تو پھر، اک نیند میں دبکے ہوئے بچّے کا
نازک خواب، چکنا چُور ہونے کی صدائیں
کون سنتا ہے!؟

برف رت میں چاندنی (ترائلے)

سفید، دُودھیا منظر پہ چاندنی کی پھُوار
تمہارے حُسن پہ جیسے مِری نظر بہکے
رگوں میں ایک مچلتا ہوا لہو کا شرار
سفید دودھیا، منظر پہ چاندنی کی پھُوار
نظر میں تیرتا بے خواب، ساعتوں کا خمار
بَدن کی شاخ پہ جیسے کوئی دھنک مہکے
سفید دودھیا منظر پہ چاندنی کی پھوار
تمہارے حُسن پہ جیسے مری نظر بہکے

سوالیہ نشان

میں سرِ وادیٔ آئینہ گراں
آنکلا
اور صدا کی
"کوئی ہے---!
کوئی ہے---! جو میرے چہرے کے کھُلے زخموں پر
میری آنکھوں
میرے آئینوں پر
اِک ذرا مرہمِ حیرت رکھ دے---"!؟

نطشے

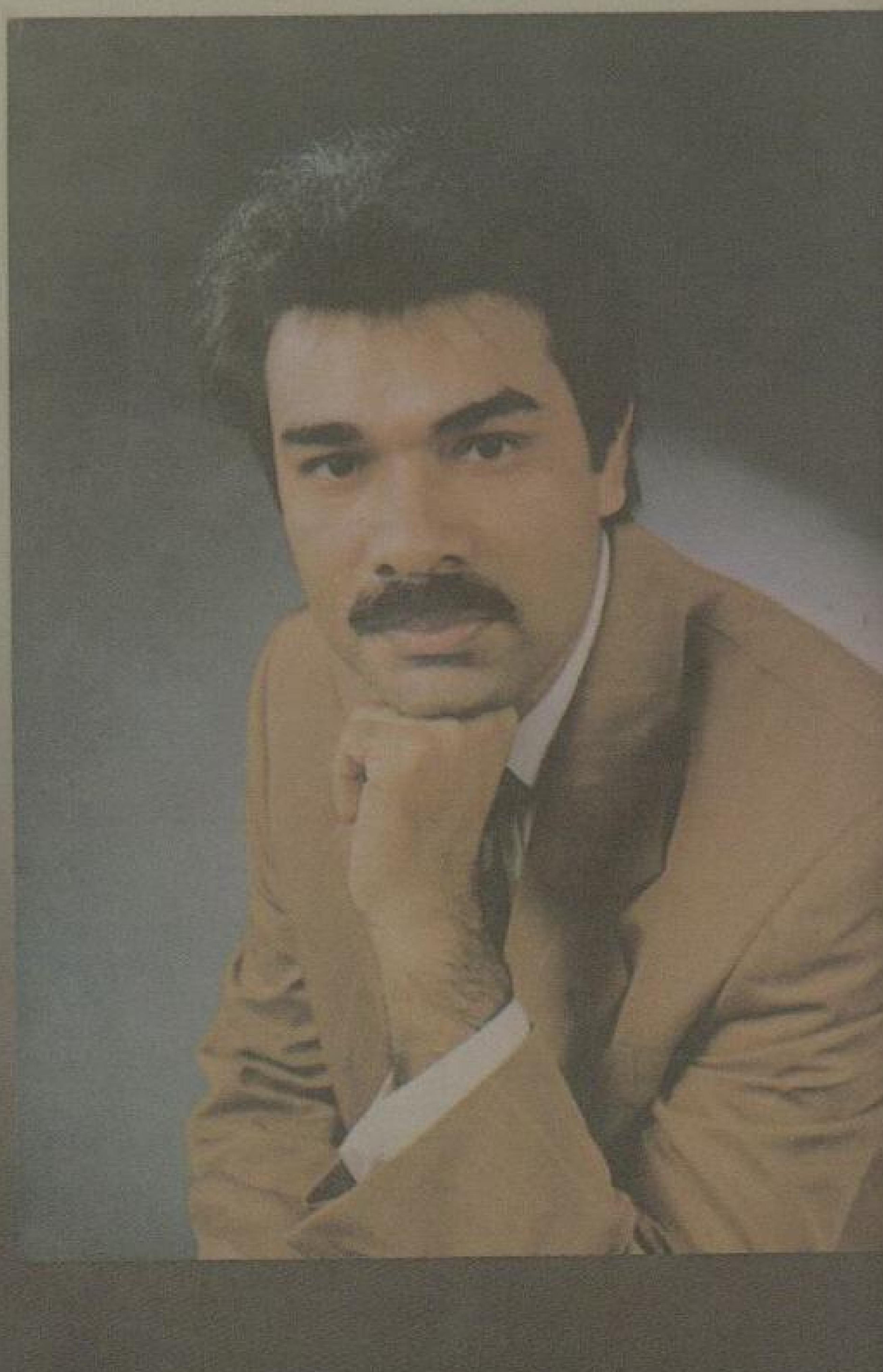
پھر یوں ہوا
کہ اِک دِن

بے سَقف گھر کا در بھی
دیوار بن گیا تھا

سَر، کِس طرح بچاتا----!

آوازوں کے ہجوم میں کہیں بہت دور سے آتی ہوئی کوئی دلنشین آواز اپنی طرف متوجہ کرے تو ایک خوشگوار سی حیرت ہوتی ہے۔ حیرت یوں کہ یہ واقعہ بہت کم کم ہوتا ہے اور خوشگوار یوں کہ ایک نئی آواز کا اپنی شناخت کے تعارفی مرحلے میں اپنی طرف متوجہ کر لینے کا عمل روز روز نہیں ہوتا۔ وطن سے دور اجنبی دیاروں میں اپنے منظروں اور اپنے چہروں، اپنی یادوں اور اپنے خوابوں سے الجھتی ہوئی زندگی کو شاعری میں منتقل کرنے والوں میں حامد یزدانی کا نام ایک اچھا اضافہ ہے۔ آغاز سفر کا دلاویز منظر فردا کے روشن امکان کی آئینہ داری کرتا ہے۔

(افتخار عارف)



نام : سید حامد یزدانی

پیدائش : ۱۲، اکتوبر ۱۹۶۱ء (فیصل آباد)

تعلیم : ایم۔اے (سوشیالوجی)

درس گاہیں : پنجاب یونیورسٹی۔ لاہور
گورنمنٹ کالج، لاہور
گورنمنٹ کمیونٹی ہائی سکول مزنگ، لاہور

مصروفیات : درس و تدریس۔ ریڈیو۔ صحافت

پتہ : ۴۰ اے مزنگ لاہور۔ ۴